ڈاکٹر راشد متین

پنجاب کی صوفیانہ شعری روایت

پنجابی زبان صوفیانہ شاعری اپنے مضامین میں، قطع نظر شعری خصوصیات کے جس خزانے سے مالا مال ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ شعری روایت صدیوں سے لگے بندھے اصولوں کی بنا پر اپنا سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ ہر دور کے شاعر اپنے حالات، ماحول، علاقے، رہن سہن، ثقافت، معاشرت، نفسیات، فلسفہ اور ادب کے حوالوں سے اس میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ پنجابی زبان میں کی گئی صوفیانہ شاعری میں بھی صوفی شعراء نے اس شعری روایت کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اس میں نو بہ نو تبدیلیاں، دریافتیں اور تجربے کر کے اسے بام اوج تک پہنچایا ہے۔

پنجابی زبان میں سب سے پہلے جس شاعر کا کلام ہم تک پہنچا وہ حضرت بابا فرید گنج شکر (وفات 1266ء) ہیں۔ مگر بابا فرید کے اشلوکوں کی زبان بڑی حد تک منجھی ہوئی اور معیاری ہے جس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ پہلے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی شعری خصوصیات کی بنا پر ان سے پہلے بھی شعراء یقیناً موجود ہوں گے جن سے انہوں نے شعوری یا لا

شعوری طور پر استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ صدیوں کے بعد اس معیار تک پہنچی تھی۔

اس کے بعد سولھویں صدی عیسوی پنجابی کے نامور صوفی شاعر شاہ حسین کا زمانہ ہے۔ ان کی وفات 1600ء میں ہوئی۔ یہ بات تعجب کا باعث ہے کہ بابا فرید سے لے کر شاہ حسین تک سوا تین صدیوں کے طویل عرصے میں ہمیں پنجابی شاعری کا سلسلہ منقطع نظر آتا ہے جو ناقابل یقین ہے۔ اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس عرصے میں بھی کئی شاعر ہوئے ہوں گے اور انہوں نے یقیناً شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا ہوگا۔ مگر وقت کی بے رحمی کے ہاتھوں ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور یا پھر انہیں سند قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ جس کی بنا پر لوگ آج ان کے نام تک سے ناواقف ہیں۔ بہرصورت شاہ حسین کے بعد یہ سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔

صوفیانہ شاعری کی لاتعداد خصوصیات اس حیثیت سے سامنے آتی ہیں کہ ان کی بنا پر اس شاعری کو دنیا بھر کی کسی بھی زبان کی شاعری کے مقابل پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کی عظمت اس کی مقبولیت میں پنہاں ہے۔ یہ اس طرح زبان زد خاص و عام ہے کہ اگر اسے کتابوں کی شکل میں محفوظ نہ بھی کیا جائے تب بھی یہ سینہ بہ سینہ رہتی دنیا تک زندہ رہ سکتی ہے۔ دوسری زبانوں کا کلاسیکی ادب محض پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہے۔ مگر پنجاب کی کلاسیکی شاعری، کیا ان پڑھ کیا پڑھے لکھے سب میں مقبول ہے۔ یہی خصوصیت اسے تمام کلاسیکی شعری روایتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان خصوصیات کے پس منظر میں ان عوامل کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن کی بنا پر یہ شعری روایت معرض وجود میں آئی۔ اس دور کے معروضی حالات، مسالک فکر، معاشرت، بود و باش، موسموں کے تغیر، فطری مناظر، لوک ورثہ لوگوں کی نفسیات اور ایسے لاتعداد ایسے عوامل ہیں جنہیں ایک باشعور شاعر کسی صورت بھی اپنی تخلیقات سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ پنجاب کی صوفیانہ شاعری کی خصوصیات میں، عوامی زبان کا استعمال، لوک کہانیوں سے مواد کی فراہمی، جذبہ عشق، تعریف حسن، وجدان و ادراک، انسان

دوستی پر اصرار، ذاتی اور عوامی معاشرت سے تشبیہات اور تلمیحات کا استعمال مضامین کا تمثیلی انداز، قرآن واحادیث کے حوالے، بزرگوں، اکابرین، زعماء اور صوفیاء سے استفادہ کا ذکر اور آہنگ وموسیقیت کے علاوہ بے شمار ایسی خصوصیات بھی شامل ہیں جن سے ایک پختہ، نا قابل فراموش اور آفاقی شاعری معرض وجود میں آتی ہے۔

پنجابی صوفیانہ شاعری میں مواد، لفظ، معنی، زبان اور اسلوب کی وہ گہرائی پائی جاتی ہے جس نے ہر شخص کو متاثر کیا۔ اس تاثر میں مذہب، عقیدہ اور مزاج بھی رکاوٹ نہیں بن سکے۔ یہی کلاسیکی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ادب ہر وقت ہر شخص کے لئے پُرکشش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں عالمگیر سچائیوں کی بات کی گئی ہوتی ہے۔ بابا فرید ہی کی مثال لے لیں۔ ان کے اشلوکوں میں علم بیان، علم بدیع اور عروض کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس کے علاوہ راگنی کے سرتال بھی جا بجا ملتے ہیں جو کہ ان اشلوکوں میں گہری تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ راگنی کا وزن سرتال کی اونچ نیچ کی بنا پر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

فریدا روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ
جنہاں کھاہدی چوپڑی گھنے سہن گے دکھ

عام بیان میں دلالت کے معانی اس طرح ہیں کہ ایک چیز، اس دوسری چیز کا پتہ دے جس کا پہلے پتہ نہیں ہے۔ یعنی ہمارا ذہن اور عقل پہلے بتائی گئی چیز سے معلومات اخذ کر کے دوسری شے تک پہنچ جائیں۔

کوک فریدا کوک توں، جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا ناں گرے، تب لگ کوک پکار

یہاں زندگی کے لئے ''ٹانڈے'' کا استعارہ کس قدر مکمل اور بے نظیر ہے۔

بابا فرید نے شاعری، محض شعر کہنے کے لئے نہیں کی تھی بلکہ وہ اس خطے کے لوگوں کو وہی کچھ بتانا چاہتے تھے جس کا روحانی تجربہ از خود کر چکے تھے۔ اس لئے وہ طریقت اور

شریعت کے ملے جلے ڈھنگ کو اپنا کر عوام کی اپنی زبان میں ان سے مخاطب ہوتے تھے۔ وہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ سادگی کے ساتھ اپنی شاعری میں اپنے آپ ہی سے مخاطب ہوتے تھے۔ یہی خوبی بعد ازاں دوسرے صوفی شعراء نے بھی اپنائی۔ انہوں نے حتی المقدور کوشش کی کہ اپنی بات کرنے کے لئے مقامی ماحول اور روایت ہی کو مدنظر رکھا جائے۔ اس کے بعد ان کے یہاں یہ خصوصیت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ مقامی ماحول میں سے محاورے اور کہاوتیں استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

فریدا جے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
اپڑیں گریوان میں سرنیواں کر کے دیکھ

اسی نوع کی شاعرانہ خصوصیت کے علاوہ شاہ حسین کے یہاں مونث کا صیغہ، استعمال کرنے کی ابتداء نظر آتی ہے۔ بجن دے ہتھ بانہہ اساڈی کیکر آ کھاں چھڈوے ازیا۔ ان کی شاعری پر فارسی شاعری کے انداز زبان اور بیان کا اثر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اسی طرح بابا فرید کی شاعری پر ہندی زبان کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسی بنا پر ان کے یہاں فارسی خیالات، فارسی تشبیہات اور استعاروں کے ہندی معنویت کے انداز بھی ملتے ہیں۔ پھر ''نی سیواسیں نیناں دے آ کھے لگے'' پوری کی پوری کافی پر فارسی خیالات کی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات اور استعاروں کا استعمال خالصتاً ذاتی، عوامی اور مقامی معاشرت کے حوالے سے نظر آتا ہے۔

گھم چرخڑیا تیری کتن والی جیوے
نلیاں وٹن والی جیوے

یہاں نہ صرف ''چرخہ'' علامت کے طور پر آتا ہے بلکہ اس کے سارے لوازمات بھی اس میں موجود ہیں۔ ''کتناں'' ''پونیا''، ترنجن، ہکھیاں، بننا، ''تمنا'' انہوں نے اپنے پیشے ہی سے لئے ہیں۔ ان کی زبان میں بابا فرید کی نسبت مٹھاس اور حسن زیادہ ملتا ہے اور ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ عوام سے باتیں کرنے والے، اگر چہ یہ عوام میں سے ہی ہیں مگر ان سے بلند تر ہیں اور ان کی بات ایک سجاؤ اور سلیقے کے ساتھ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ شاہ حسین کہتے ہیں:

نی تینوں رب نہ بھلی ، دعا فقیراں دی ایہا
رب نہ بھلی، ہور سب کجھ بھلی ، رب نہ بھلن جیہا

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ شعر و ادب کے اسلوب یا انداز بیان کے طریقے بہت سے ہیں۔ جن میں تمثیلیہ، رمزیہ اور مسجع زیادہ اہم ہیں۔ شاہ حسین کے یہاں یہ تینوں صورتیں مجسم ہو کر سامنے آتی ہیں۔ پنجابی ادب میں شاہ حسین کی ''کافیاں'' وارث شاہ کی ''ہیر'' میاں محمد بخش کی ''سیف الملوک''، تمثیلی انداز کی مثالیں ہیں۔

شاہ حسین نے تمثیل کو رمزیہ کبھی بھی نہیں بننے دیا۔ کیونکہ انہوں نے جن علامتوں کا استعمال اپنی شاعری میں کیا، وہ عوامی علم سے باہر کی نہیں ہیں۔ بلکہ عام گھروں کی اپنی باتیں ہیں۔ وہی بات زیادہ موثر ہوتی ہے جو سادہ زبان میں تھوڑے لفظوں میں، نزدیک ترین تشبیہات کے ساتھ کہی جائے۔ کافی صنف ہی ایسی ہے کہ اس کے لئے روانی، سادگی اور مٹھاس لازمی ہو جاتے ہیں۔ شاہ حسین کی شاعری میں زبان کی روانی انہی خصوصیات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے:

سجن دے ہتھ بانہہ اساڈی، کیکر آکھاں چھڈ دے اڑیا
رات ہنیری بدل کنیاں باجھ وکیلاں مشکل بنیاں

شاہ حسین کی شاعری میں جذبہ اور خیال ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایسا کہیں نہیں کہ خیال جذبے سے الگ ہو جائے۔ اسی لئے ان کی کافیوں میں بلا کا والہانہ پن اور احساس کی شدت ہے اور ان کا اظہار بڑا دھیما اور اثر کرنے والا ہوتا ہے۔ شاہ حسین نے جہاں روزمرہ کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کو عوام کے ذہنوں سے الگ نہیں ہونے دیا وہاں انہوں نے اپنی شاعری میں عوام کے رسم و رواج، اُن کے رہن سہن اور بول چال کا خیال بھی رکھا رہے۔ اس کے ساتھ ہی

انہوں نے عام لوگوں کی نفسیات کو بھی اپنی شاعری سے دور نہیں ہونے دیا۔ ان رومانوی داستانوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے جو اس وقت عام لوگوں کے دل میں رچی ہوئی تھیں۔

رانجھن میرا، میں رانجھن دی، کھیڑیاں نوں کوڑی جھاک

ان کے یہاں انسانی رشتوں اور انسانوں سے پیار کا گہرا احساس بھی ملتا ہے۔

شاہ حسین کی کافیاں زیادہ تر راگوں اور راگنیوں میں تشکیل پاتی ہیں۔ انہوں نے از خود خاص خاص راگوں اور راگنیوں کے بول تیار کیے اور ان میں اپنے خیالات رچائے انہوں نے اپنی بہت سی کافیوں کے عنوانات بھی راگوں اور راگنیوں کے نام پر رکھے ہیں۔ ان میں شری راگ، گوری، کافی، آسا، اسادری، جھنجوٹی، گجری، دیوگندھار، بڈہنس، سورتھ، دھنا سری، جے جے ونتی، تلنگ، نہڑا، مارو کا نہڑا، کلیان، للت اور دھنا سری شامل ہیں۔ انہوں نے جو راگ زیادہ تر استعمال کیے ہیں وہ زیادہ تر صبح کاذب اور صبح صادق کے راگ ہیں اور ان کے بعد رات کے راگوں کا نمبر آتا ہے۔ صبح کی کرن پھوٹتے وقت کا راگ ''آسا'' ان کے یہاں اس طرح جلوہ افروز ہے۔

جاگ نہ لدھی آسن چند سے سبھو وہانی رات

(رات کے راگ) ''شری راگ'' کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

ربا میرے حال دا محرم توں، اندر توں ہیں باہر توں ہیں روم روم وچ توں

شاہ حسین کی کافیوں کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو احساس ہوگا کہ وہ موسیقی کی ان باریکیوں اور رموز کی تفصیلات سے واقف تھے جن کی تہہ تک صرف بہت بڑے موسیقار ہی پہنچ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے رسم و رواج کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

سلطان باہو نے اپنی شاعری کے اظہار کے لئے ''ابیات'' کی صنف کو چنا جو دوسری زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں مروج اور مستعمل نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ باہو کی شاعری کی امیجری عرب و عجم کی شاعری سے مستعار نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں امیج خالصتاً اس

ماحول اور اس سرزمین سے ان کے تخیل میں وارد ہوئے جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ اور جس کی بو باس ان کی رگ وپے میں رچی ہوئی تھی ۔ وہ پیکر تراشی کے لئے امیجز (Images) مناظر فطرت سے لیتے ہیں یا اپنے آس پاس کے لوگوں کے شعبہ کارکردگی سے جو کہ زراعت تھا۔

باہو کا رابطہ عوام کے ساتھ ایک ہمجولی کا سا نہیں لیکن وہ ان کے جذبات و احساسات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بات کرتے ہیں۔ مگر ان کے لہو و لعب میں شریک نہیں ہوتے۔ شاعری میں ان کا تصور ہمارے سامنے معلم اخلاق اور مرشد کامل کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ وہ جذبہ تخیل کی دنیا میں الفاظ کے ذریعے ایک ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ آج بھی جب لوگ ان کے بیت سنتے ہیں، تو نغمہ داؤدی کا سا اثر ہوتا ہے۔ اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر مصرعے کے آخر میں ''ہو'' کا کلمہ آفاقی ایک الگ جادوئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ موسیقی کی تمام تر بندشوں کے مطابق تحریر کئے گئے ''ابیات'' جب کسی بھی مترنم محفل میں پڑھے جاتے ہیں تو کون سا دل ہے جو ہل نہیں جاتا۔ ان میں جذبہ کی گرمی بھی ہے اور تخیل کی لطافت بھی، الفاظ میں معنی آفرینی بھی ہے اور لحن کی تاثیر بھی۔

سلطان باہو کی شاعری میں جذبہ عشق کے علاوہ انسان دوستی، عوامی زبان، لوک داستانیں، عوامی معاشرت، قرآن و حدیث کے حوالے، موسیقیت، تشبیہات، استعارے تلمیحات اور تمثیلات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

بلھے شاہ نے انہیں خصوصیات کو اپناتے ہوئے اپنے شعری محاسن کی تکمیل کی ۔ بلھے شاہ کی زبان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ وہ اپنے دل کی آواز اس روانی اور ترنگ کے ساتھ اپنے سامع کو سناڈالتے ہیں کہ سننے والا عرصے تک خمار میں رہتا ہے۔

بلھے شاہ دی سنو حکایت ہادی پکڑیا ہوگ ہدایت
میرا مرشد شاہ عنایت اوہ لنگھائے پار

اپنی معاشرت کے محاوروں اور تشبیہات کو انہوں نے بھی تمثیلی انداز میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ میری بکل دے وچ چور نی۔ والی کافی ایسی ہی تمثیل کی آئینہ دار ہے۔ بلکہ اس میں ان کا انداز نسبتاً تجریدی ہے۔ انسانی کی بھلائی اور اتحاد کی راہ بلھے شاہ نے جس شدت کے ساتھ اپنائی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

بلھے شہ کا بیشتر کلام صنائع بدائع سے معرا ہے۔ جو بات ہے سیدھی ہے۔ لیکن جذبے کی شدت اور نظر کی گہرائی اس میں کہیں کہیں وہ اثر پیدا کرتی ہے کہ فن منہ دیکھتا رہ جاتا ہے ان کے شعر کی سادگی Premitive ہے اور پریمیٹو فن کی طرح کھردری اور طاقت ور ہے۔ کسی کسی جگہ صوتی آہنگ کا حسن بھی چمک اٹھتا ہے جو حروف علت کی بجائے حروف صحیح کی تکرار سے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ بلھے شاہ کے کلام میں بلند آہنگی اور کھردرا پن ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

علی حیدر ملتانی کے یہاں بھی شاعری کی کم وبیش ایسی ہی خوبیاں اور فنی محاسن نظر آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی معاشرت، رہن سہن اور ثقافت کو نظر انداز نہیں کرتے اور اپنی شاعری میں بنیاد کے طور پر انہی سے متعلق کرداروں یا اشیاء کا استعمال کرتے ہیں۔

چھن چھن چوڑا تے گھم گھم چاٹی، ایہہ گھمکار مدھانی دے نی
علی حیدر جے ہتھ مکھن آوے، تاں مطلب ایس نمانی دے نی

ان اشعار میں بہت سی خوبیاں اور خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اول تو معاشرت، دوئم منظر نگاری، سوئم فکر، چہارم تشبیہ، پنجم منزل یا مقصد اور ششم آہنگ ہے۔ علی حیدر کی شاعری ایسے ہی رواں دواں مترنم، مسجع اور سادہ تر پیرایہ اظہار سے بھری پڑی ہے۔ حسن اور ماحول کو انہوں نے بھی اپنے اشعار کا منبع بنایا ہے۔

علی حیدر ایسے شاعر ہیں جو مجاز میں سے حقیقت تلاش کرتے ہیں۔ جذبہ عشق ان کے ہاں دوسرے صوفی شاعروں کی طرح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

علی حیدر کے کلام میں سادگی، سوز، تڑپ اور موسیقی کا خوب امتزاج ملتا ہے۔ تکرار لفظی کے تحت وہ اپنے اشعار میں اس قدر موسیقیت بھر دیتے ہیں کہ انہیں خواہ مخواہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔

ہاشم شاہ جو پنجاب کے معروف صوفی شاعر ہیں، کا انداز سادہ اور رواں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے بیان میں وہ ایک وقار بھی قائم رکھتے ہیں اور اخلاقیات کا درس پس الفاظ دیتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پنجابی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کی اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر حلقے کے لوگوں کے لئے شاعری کی۔ مگر ان کی شہرت کا اصل سبب ان کی پنجابی شاعری ہی بنی۔ ان کے یہاں حسن بیان اور اختصار جلوہ افروز نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے مضمون اور واقعے کو اس روانی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں کہ وہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ وہ زبان، بیان، خیال، شعور اور احساس سب کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اور معانی کے نئے نئے روحانی صوفیانہ رنگ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ باوا بدھ سنگھ کے الفاظ میں'' ہاشم نے عام لوگوں کی زبان میں اظہار خیال کیا ہے اور پروفیسر ہرنام سنگھ شان کی رائے ہے کہ ہاشم جی کی شاعری کی زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ اس کی روح خالص دیسی ہے۔ جذبہ عشق کی دھیمی دھیمی آنچ ان کے ہاں جوالا بن جاتی ہے۔

پنجابی صوفی شعرا میں میاں محمد بخش از خود خوش الحانی اور شعر ٹھیک سے پڑھنے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے سبھی کردار خوش لقا خوش ادا اور خوش الحان بھی ہیں۔ وہ موسیقی کے دقیق رموز پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے ہر ہر شعر میں موسیقیت رچی ہوئی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

نچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
کیکر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

میاں محمد کو شاعری میں لطافت اور ایمائیت بے حد عزیز رہی ہے۔ لیکن وہ اس ایمائیت اور لطافت کے ساتھ تمثیلی پیرائے کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں تا کہ ابلاغ میں دقت نہ ہو۔ اس تمثیلی پیرائے کو انہوں نے اس انداز سے برتا ہے کہ ان کی بیان کردہ داستانیں لوک داستانوں کا درجہ اختیار کر گئی ہیں:

اک کالے اک سبز کبوتر اک چٹے بن آئے
چٹے کالے ملن محمد نہ بن بہن پرائے

روز مرہ کے مشاہدات و تجربات کو سادہ اور دلنواز انداز میں سمونے کے علاوہ، ان کی تخلیقات کی ایک اور اہم فکری خصوصیت، ان کا بیان کردہ وہ نظریہ عشق ہے جو انہیں وحدت الوجودی مکتبہ فکر سے وابستہ کرتا ہے۔

منظر نگاری اور سراپا نگاری کے لئے ان کی تصنیف ''سیف الملوک'' کی نظیر مشکل ہی سے ملتی ہے۔ داخلی کیفیات کی تجسیم کے لئے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں بہت سے نئے الفاظ اور تراکیب بھی وضع کرنا ان کے یہاں خاصی حد تک اہم معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ غلام فرید ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی معاشرت جو کہ ''روہی'' کے رہن سہن کے متعلق تھی، اُسی کے مناظر کو داخلی کیفیات بیان کرنے کے لئے خارجی پس منظر میں استعمال کیا ہے:

آؤ چنوں رل یار پیلو پکیاں نی وے
کئی اودیاں گلنار کٹویاں رتیاں نی وے

اس طرح کلاسیکی اور رومانی دونوں لہجے خواجہ فرید کے یہاں یکجا ہو گئے ہیں۔ ان کی کافیاں غزل مسلسل کی صورت سامنے آتی ہیں جن میں سادگی، رومانیت، منظر نگاری، اخلاقیات، پند و نصائح، انسان دوستی، موسیقیت وغیرہ ایک دوگونہ امتزاج کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہیں۔ خواجہ فرید نے اپنے کلام میں وقت کی حقیقتوں اور سچائیوں کو جگہ دی ہے۔

ہمارے پنجابی شعرا کے یہاں مقامی رنگ ڈھنگ اور انگ قدرتی امر ہے۔ جس زبان کا جس قدر عظیم لوک ورثہ ہوتا ہے، اس کی جڑیں عوام میں اتنی ہی گہری ہوتی ہیں اور اس زبان کے شاعر، لوک رنگ کو اپنی شاعری میں ابھارنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پنجاب کے لوک گیتوں میں پنجاب کا عام رہن سہن، مقامی اور قدرتی نظارے رسمیں، رواج، فصلیں اور تہوار غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں مواد موجود ہے۔ میاں محمد بخش نے ''سیف الملوک'' میں مجازی اور حقیقی دونوں رنگ اپنائے ہیں۔ اس میں تشبیہات، استعارے اور دوسری صفات سے قطع نظر سراپا نگاری اور قدرتی مناظر کی منظر کشی بھی خوب خوب کی ہے۔ اور قاری ان منظروں میں کھو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کا اپنا ماحول ہے جو تشکیل پاتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ صوفی شعراء نے اپنی رسوم و رواج کو بھی علامت یا کنائے کے طور پر اپنی اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جس کی بنا پر مقامی رنگ کا کھلا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ حسین نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ پنجاب کے رہن سہن اور مقامی رنگ ڈھنگ سے بھر پور مضامین استعمال کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماحول کی دستکاری یعنی سوت کاتنے کے سارے عمل کے حوالے سے اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اور لوک رنگ کو اپنی شاعری میں رچا لیا ہے تا کہ لوگ ان کی فکر کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پنجاب کے عوام، رسوم و رواج اور ثقافت رچ بس گئے ہیں۔

اسی طرح جب ہم بلھے شاہ کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے ہاں بھی یہ لوک انگ بھر پور انداز سے سامنے آتا ہے بلکہ ان کی آفاقی حیثیت کا اصل بھید ہی ان کا جگ پیار ہے۔ انہوں نے اپنی تمام شاعری میں تشبیہات اور استعارے اپنے گرد کے ماحول سے حاصل کیے ہیں۔ ان کا پیغام عام لوگوں تک چرخہ، پونی، ہتھی، ترنجن، شادی، بیاہ، جہیز اور مکلاوے وغیرہ کے ذکر کے ساتھ پہنچا ہے۔ اسی طرح پنجاب کی روایات، لوک گیت، زیور، رسمیں رواج اور لوک کہانیاں اور ان کے کرداروں کو انہوں نے ایسے انداز کے ساتھ اپنی شاعری میں جگہ

دی ہے کہ ان کی شاعری میں پنجاب کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اس موقع پر اگر ہم پنجاب کے ایک اور مہان شاعر کا تذکرہ نہ کریں تو یہ بہت زیادتی ہوگی۔ وہ اگر چہ صوفی شاعر تو نہیں ہیں مگر پنجاب کی شاعری کو جو خزانہ انہوں نے دیا ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ وہ شاعر وارث شاہ ہیں۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے تو انہیں بھی صوفی شاعر قرار دے دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک انہوں نے بھی مجاز کے رنگ میں تصوف کی باتیں کی ہیں۔ مگر بہت سے مستند نقادوں کے مطابق انہیں ان کے کلام ہی کے باعث صوفی شاعر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وارث شاہ کی ''ہیر'' تو ہے ہی ''دیوانِ پنجاب'' جس میں ان کے وقت کے پنجاب کا تمام تر سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر ادبی قدروں، رویوں اور سوچوں کی تصویر بن کے سامنے آ جاتا ہے۔

الغرض پنجاب کے قریباً تمام کے تمام صوفی شعراء میں جہاں ان کی شاعری کے فنی محاسن پورے جوبن کے ساتھ سامنے آئے ہیں وہاں بہت سی مشترک خوبیاں بھی ہیں۔ ان میں عوامی زبان کا استعمال، لوک رنگ، لوک کہانیوں سے مواد کی فراہمی، جذبہ عشق، اظہار حسن و جدان، انسان دوستی پر اصرار، ذاتی اور عوامی معاشرت سے مواد کی فراہمی، قرآن و احادیث اور اکابرین کے حوالے، دین متین کے قیام کی تلقین، وحدت افکار، معاشرتی صورتحال کا ردعمل اور موسیقیت وغیرہ شامل ہیں۔ ان خصوصیات اور شعری محاسن نے پنجاب کی صوفیانہ شعری روایت کو وہ گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے کہ جس کی بنا پر بڑے بڑے فلسفیانہ اور روحانی مسائل کی گتھیاں نہ صرف عام فہم انداز میں بطریق احسن سلجھائی گئی ہیں بلکہ صوفیانہ نقطہ ہائے نظر بھی عوام کے ذہنوں تک بآسانی پہنچ سکے ہیں۔